© rasailojaraid.com

اسلاموفوبیا کا مستقبل

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

اسلاموفوبیا کی اصطلاح ۱۹۹۰ء کے عشرے میں Runnymede ٹرسٹ کی جانب سے جاری کردہ برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے متعصبانہ طرزِ عمل کے حوالے سے ۱۹۹۷ء میں استعمال کی گئی اور بہت جلد شہرت حاصل کر گئی۔ گو اس اصطلاح (Phobia) کا استعمال اس نفسیاتی کیفیت کے لیے کیا جاتا رہا ہے جس میں کسی واہمہ سے متاثر ہو کر ذہن میں ایسا خوف و ہراس جگہ کر جائے کہ انسان ایک روزمرہ کی چیز سے بھی ہراساں ہونا شروع کر دے۔ مثلاً کسی فرد کے محض بلی کا نام سن کر رونگٹے کھڑے ہو جانا یا کسی بچے کا اسکول کے نام سے پیٹ میں درد محسوس کرنا۔[1]

اسی نفسیاتی کیفیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمانوں جیسے بے ضرر برطانوی باشندوں سے خوف محسوس کرنے کو Islamophobia سے تعبیر کیا گیا۔ کثرتِ استعمال کی بنا پر آج یہ اصطلاح عموم اختیار کر گئی ہے اور اپنی ابتدائی جاذبیت سے محروم ہو چکی ہے۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو اس اصطلاح میں پوشیدہ منفی مفہوم اور خوف کے مخاطب یورپ و امریکہ میں پائے جانے والے وہ افراد ہیں جنہیں ایک امریکی دانشور نے WASP کی اصطلاح سے ظاہر کیا تھا یعنی White Anglo Saxon Protestants[2]، اسلاموفوبیا کا وجود نہ تو سیاہ فام امریکی باشندوں میں پایا جاتا ہے اور نہ افریقی ممالک میں۔ عملاً اس کے مریض یا شکار سفید فام پروٹسٹنٹ انگریزی النسل ہی نظر آتے ہیں۔ جس طرح Cat phobia میں بلی کا کوئی قصور سوائے اس کے کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر نہیں آتا کہ اس کے منہ میں دانت اور پاؤں میں پنجے ہوتے ہیں جنہیں خطرے کی شکل میں وہ استعمال کرسکتی ہے، جب کہ عام حالات میں وہ ہر اس شخص سے دوستانہ ماحول میں ملتی ہے جو اسے بری نگاہ سے نہ دیکھے۔ بالکل اسی طرح دنیا کی آبادی کے تقریباً ایک چوتھائی حصے کے بارے میں یہ واہمہ ذہن نشین کرنے کا نام اسلاموفوبیا ہے کہ ہر مسلمان ایک غالی ممکنہ حملہ آور ہے۔

اسلاموفوبیا کی اصطلاح کا اطلاق ان تمام مغربی اقوام پر کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے مغرب بلکہ خود اپنے آبائی وطن میں ہوتے ہوئے ان کے لیے ایک انجانے خطرے اور خوف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی فوبیا انفرادی طور پر ہو تو بہ آسانی نفسیاتی طریقہ علاج سے اس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر ایک پوری قوم کو یہ مرض لاحق ہو جائے تو مرض کی تشخیص کے لیے ایک طویل حکمت عملی ہی اصلاح کی شکل پیدا کرسکتی ہے۔

مغرب کو مسلمانوں سے جن خدشات اور ''خطرات'' کا خوف ہے اگر معروضی زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ خود مغرب کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ شام کے بشارالاسد کے حوالے سے امریکہ نے زبانی دعوے تو بہت کیے اور اپنے ایک حلیف ملک کو دخل اندازی پر آمادہ بھی کر لیا اور بات چھیڑ چھاڑ سے تجاوز بھی کر گئی لیکن جب عسکری حمایت سے بشارالاسد کو ہٹانے کا موقع آیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ امریکہ کی یہ خارجہ پالیسی نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ عالمی طور پر دور اندیشی پر مبنی نہیں رہی اور یہی وجہ ہے کہ بشارالاسد جسے بہ آسانی تبدیل کیا جاسکتا تھا، امریکی خارجہ پالیسی کی ناکامی کی بناء پر اپنے روایتی حمایتی روس سے بھاری مقدار میں عسکری قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور امریکی عاقبت نااندیشی نے مشرق وسطیٰ میں دوبارہ روسی اثر کو بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔

مشرقِ وسطیٰ ہی نہیں دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان سیاسی اقتدار پر فائز ہیں ان کے حوالے سے مغرب کی ترجیحات اور حکمت عملی میں دو پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول یہ کہ مسلم ممالک میں جہاں کہیں بھی ممکن ہو مسلکی اختلافات کو ہوا دی جائے اور مسلمانوں کو ایک اندرونی خلفشار میں اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح الجھا دیا جائے کہ وہ مغرب کی طرف اگر دیکھیں تو صرف امداد کی بھیک مانگنے کے لیے۔ ان کے ذہن سے مغرب تک اپنی دعوت پہنچانے کا خیال محو ہو جائے۔ چنانچہ لبنان کی سیاست ہو یا فلسطین میں غزہ کے سانحہ کے بعد کی صورت حال، شیعہ اور سنی جذبات اور اختلافات کو نہ صرف ہوا دی گئی بلکہ ان میں اضافہ کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ یہی شکل عراق میں شیعہ اور سنی عسکری ٹکراؤ کو بڑھا کر پیدا کی گئی اور پھر سعودی عرب اور یمن میں یا ترکی اور ایران کی سیاست یا افغانستان میں شیعہ اور سنی تقسیم اور پشتو اور فارسی بولنے والوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کروانے میں مغرب کی شاطرانہ سیاست اور حکمت عملی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اگر غور کیا جائے تو روز روشن میں جو تحریر دیوار پر نظر آرہی ہے اس پر کفِ افسوس ملنا اپنی جگہ لیکن اس بیرونی حکمت عملی کے کارگر ہونے میں زیادہ دخل عموماً خود گھر کے بھیدی کا رہا ہے۔ جہاں کہیں ممکن ہوا شیعہ یا سنّی اقلیت میں پائی جانے والی ان کی نفسیاتی کیفیت کو، جو اقلیت میں اکثر ہوتی ہے، استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب تک وہ اقلیت، چاہے وہ شیعہ ہو یا سنّی، خود اس تخریبی عمل میں شامل نہ ہو، گھر سے باہر کی قوت مسلمانوں کو آپس میں نہیں ٹکرا سکتی۔ حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی یا سادہ لوحی نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت اور عقل اور عدل کا فقدان، اپنے دوست اور دشمن میں فرق نہ کرنا اور ہر سفید فام کی چرب بیانی کو اپنی خیر خواہی سمجھنا بھی اس آزمائش کے پیدا ہونے کا ایک بڑا سبب رہا ہے۔

مغرب کی جانب سے دوسرا اہم پہلو جو اس کی حکمت عملی اور ترجیحات میں نظر آتا ہے۔ نظری محاذ پر اسلام کی جامع تعلیمات میں سے ان اجزاء کو سیاق وسباق سے نکال کر موضوع تحقیق اور ابلاغ عامہ کے ذریعہ عالمی سطح پر مشہور کرنا ہے جو مغرب کے خیال میں دقیانوسیت، بنیاد پرستی، شدت پسندی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کو فروغ دینے کا سبب ہیں۔ اس کا ردعمل وہی ہوا جو متوقع تھا یعنی مسلم دانشور دفاعی حکمت عملی میں الجھ گئے چنانچہ معذرت خواہانہ رویہ فروغ پانے لگا۔ دوسری جانب جن مسلمانوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور مغربی تجزیے کا ردّ تاریخی حقائق کے ذریعے کرنا چاہا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں روایت پرست حتیٰ کہ ''بنیاد پرست'' تک کہہ دیا گیا۔

اس طرح مغرب کو یہ بات باور کرانے میں آسانی ہوگئی کہ دنیا میں سیکڑوں قسم کے اسلام پائے جاتے ہیں آخر کون سے اسلام کو معتبر مانا جائے۔ گویا اسلام اس دور میں مستند نظام نہ ہونے کی بناء پر قابل عمل دین نہیں بن سکتا۔ یہ وہ مفروضہ نتائج ہیں جو اسلاموفوبیا کی تحریک اور اس کی علمی کاوش اور محاذ بندی کے نتیجہ میں اختصار کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مغرب کی اس حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ان موضوعات کو زیر بحث لانا ہے جو مغربی زاویہ سے مسلمانوں کو دفاع اور مغرب کو نام نہاد غالب عسکری ہونے کی بناء پر فوقیت دینے میں مددگار ہو سکتے ہوں۔ ان میں سرفہرست اسلامی ریاست اور خلافت کا تصور ہے۔ گذشتہ تین دہائیوں سے مغربی دانشور اور ان کے زیر تربیت دکتورہ (پی ایچ ڈی) کرنے والے یا ان سے قریبی ذہنی تعلق رکھنے والے مسلم دانشور یہ بات بار بار دہرا رہے ہیں کہ اسلامی ریاست کا کوئی تصور نہ قرآن میں ہے اور نہ تاریخ فراہم کرتی ہے اور اسلامی نظمِ مملکت (Governance) دراصل بادشاہت یا اس سے ملتی جلتی شکلوں پر مبنی ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ خلافت اسلامی اصطلاح ہی نہیں ہے اور اسلام کو ایک نئے بیانیہ کی ضرورت ہے!

مزید یہ کہ چونکہ خلیفہ اور خلافت کے تصور میں ''مذہبی'' رنگ پایا جاتا ہے اس لیے کسی ایسے سیاسی نظام کا کسی مسلم ملک میں نافذ ہونا جو بنیادی طور پر ''مذہبی'' ہو یا اس پر مذہبی ہونے کی چھاپ ہو تو وہ حقوق انسانی کے لیے خطرہ اور اقلیات کے لیے موت کا پیغام ہوگا۔ اس لیے اسلامی ریاست، جو ان کے تصور میں ایک مذہبی ریاست (Theocracy) ہی ہو سکتی ہے، اس ترقی یافتہ اور روشن خیالی کے دور میں ماضی کے مذہبی اجارہ دارانہ اور مذہبی بربریت پر مبنی رویوں کو زندگی بخشنے کا باعث ہوگی۔ چنانچہ تجویز کیا گیا کہ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ خلافت وغیرہ کے جھگڑے میں نہ پڑیں اور تابعداری کے ساتھ مغربی لادینی جمہوریت پر ایمان لا کر اس کی خدمت میں سرگرم ہوں! اس سے ملحق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا شوشہ یہ چھوڑا گیا کہ اسلامی قانون قدیم قبائلی رسوم و رواج سے ماخوذ ہے اس لیے اس کی سزائیں شدید اور جدیدیت سے متصادم ہیں خصوصاً ان کے نفاذ سے غیر مسلم اور خواتین بے سہارا ہو جائیں گے۔ ان موضوعات کو بین الاقوامی سطح پر اور علمی رسائل کے علاوہ تمام اخباری اور ابلاغی جرائد میں بھی موضوع بحث بنایا جاتا رہا ہے۔

ان میں سے ہر موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس پر سیر حاصل گفتگو کی جائے لیکن جگہ کی قلت کے سبب ہم صرف نکات کی شکل میں اپنے موقف کو بیان کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح کا تصور امریکی سرپرستی میں شام میں قائم ہونے والی نام نہاد ''اسلامی ریاست'' (داعش) نے پیش کیا ہے قرآن وحدیث میں اس کی کوئی بنیاد نہیں پائی جاتی۔ قرآن کریم کسی بھی نام نہاد مسلمان خلیفہ یا امام کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ اہل ایمان کی گردنوں پر چھری چلائے اور ایسے غیر اسلامی عمل کو ''نفاذِ شریعت'' کا نام دے۔ اسلام بعض گھناؤنے جرائم کو روکنے کے لیے ان کی سخت سزائیں مقرر کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اہتمام بھی کرتا ہے کہ ایسی سزائیں انتہائی جامع تحقیقات کے بعد ہوں اور آئندہ کے لیے اس طرح درسِ عبرت بنیں کہ آئندہ ان سزاؤں کو دینے کے مواقع کم سے کم ہو جائیں۔

جہاں تک اسلامی ریاست یا نظام خلافت کے قیام کا تعلق ہے قرآن وسنت نے انتہائی واضح الفاظ میں اس اصطلاح کے مفہوم اور شرائط وخصوصیات کو اصولی طور پر متعین کر دیا ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں ہر دور کے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں قانون سازی اور مجتہدانہ رائے قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے قرآن کریم میں سلطنت کی اصطلاح کا استعمال اور حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالہ سے ان کا خلیفہ مقرر کیا جانا اسلامی تصور ریاست وحکمرانی کی وضاحت کرتا ہے کہ اسلام میں سیاسی اور ''دینی'' معاملات میں علاحدگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت یوسف علیہم السلام کی مثالیں بیان کر کے یہ بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واضح کردی کہ ان انبیائے کرام کے وظائف اور ذمہ داریوں میں وحی الٰہی کا وصول کرنا اور اس کا ابلاغ اور نفاذ کرنے کے لیے سلطنت کے اداروں کا استعمال کرنا بربنائے شریعت تھا۔ اس لیے اسلام میں دین و سیاست کی تفریق نہیں ہو سکتی اور اسی اسوہ انبیاء علیہم السلام کو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام اور اس ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی حیثیت سے مقدمات کے فیصلے، حدود کے اجراء، سیاسی پالیسی کی تشکیل، زکوٰۃ کے نظام کا قیام، معاہدوں کا کیا جانا یا معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان، غزوات میں بحیثیت سپاہ سالار اعلیٰ قیادت کرنا اور راتوں میں قیام اللیل اور طویل رکوع و سجود کے ساتھ رمضان کے علاوہ عام دنوں میں روزوں کا اہتمام غرض ہر وہ عمل جسے بعض اوقات انسانی ذہن اپنی محدودیت کی بنا پر کسی ایک دائرہ میں محدود کر دیتا ہے اور اسے ایک نام دے دیتا ہے ان تمام ذہنی درجہ بندیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اسلام جامع، کامل اور ابدی سنت کے ذریعہ ریاست، معاشرت، معیشت، ثقافت، قانون پر ہر ممکنہ انسانی سرگرمی کے شعبے کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا کا تابع کر کے حاکمیت الٰہی کے قیام کا حسین ترین نمونہ عملاً قائم فرما کر مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ فکری اشکالات کو رفع کر دیتا ہے۔

خلفاء راشدین نے اسی جامع اور واضح اسوہ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے دور میں بعض تفصیلات کا تعین کیا اور بعد میں آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔ اس طرح کم از کم اسلامی نظام حیات کی بنیادیں متفقہ طور پر طے پا گئیں اور تہذیبی تاریخ کے کسی بھی مخلص طالب علم کے لیے یہ گنجائش نہیں رہی کہ وہ اچک اچک کر پوچھے کہ اسلام میں حکومت کا تصور کیا ہے، خلیفہ کی یا فرمانروا کی صفات کیا ہوں گی یا حکومت کا دائرہ کار کیا ہوگا، بین الاقوامی معاہدوں کے تنازعات کس طرح طے پائیں گے وغیرہ۔

یہی شکل اسلامی قانون کے حوالے سے ہے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے نہ صرف اصول بلکہ بنیادی معاملات میں متعین قانون اور بہت سے معاملات میں قانونی رہنمائی فراہم کر دی تاکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر نئی صورت حال کا حل قرآن و سنت کے ابدی تشریعی احکام کی روشنی میں اجتہاد، اجماع اور قیاس کے ذریعہ تلاش کیا جا سکے۔ اسلامی قانون کی اس بنیادی حرکیت کی بنا پر کسی بھی دور میں چاہے حکمران اسلام پر عامل ہو یا نہ ہو قانون کا ادارہ مکمل آزادی کے ساتھ مسلم معاشرہ کی رہنمائی کرتا رہا حتیٰ کہ برصغیر میں انگریز کے غیر عادلانہ دور میں بھی شریعت کے بہت سے احکام جوں کے توں جاری رہے اور بعض علاقوں میں نہ صرف دیوانی بلکہ فوجداری معاملات بھی شریعت کے مطابق انگریز کی غلامی کے دوران بھی جاری رہے۔ ریاست سوات، ریاست قلات اور کشمیر میں خصوصی طور پر شرعی احکام پر مسلسل عمل رہا جبکہ شہری آبادیوں میں انگریز کا دیا ہوا قانون متوازی طور پر چلتا رہا۔

شریعت سے محض سزاؤں کے نظام کا مراد لینا ایک علمی بد دیانتی ہے۔ جس کا ارتکاب غیر مسلم اور مسلم دانشور دھڑلے کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس غلطی کے ارتکاب کے بعد مزید یہ جسارت بھی کرتے ہیں کہ شرعی حدود کو وقت اور رسوم کا غلام بنا کر ان پر نظر ثانی کرنا بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں تصورات اسلام سے باہر کے تصورات ہیں جو بعض مسلم دانشوروں نے غالباً غیر شعوری طور پر اختیار کر لیے ہیں۔ مغربی مفکرین کی لاعلمی تو قابل فہم ہے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن و سنت سے براہِ راست استفادہ کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن مسلمان دانشور جو روشن خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں کم از کم ان کے پاس اس بات کا کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ کیا ضروری ہے کہ ایک شخص علم طب کی کسی نصابی کتاب کو پڑھے بغیر کسی ہسپتال میں ایک معینہ عرصہ تک عملاً طب کی مشق کیے بغیر طبیب بن کر بیٹھ جائے اور اصرار کرے کہ اس کی تجویز کردہ ادویہ ہی مرض کا صحیح علاج فراہم کرتی ہیں؟ اگر ہر بوالہوس حسن پرستی اختیار کر لے تو بیچارہ غالب یہی تو کہے گا اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر کہاں۔

مغرب کے نفسیاتی مرض یعنی مسلمانوں اور اسلام سے ان جانے خوف و ہراس کا علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہر وہ مسلمان جو مغرب میں مقیم ہو معذرت خواہانہ رویہ کی جگہ اسلام کے دعوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انداز کو اختیار کرے اور حکمت نبویؐ اور حکمت قرآنی کے ساتھ اسلام کی صحیح تصویر اپنے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی طرزِ عمل کے ذریعہ اپنے گرد و پیش کے افراد کے سامنے نہ صرف پیش کرے بلکہ شعوری طور پر ان تک پہنچائے۔ اگر ایک مسلم کالج کے احاطہ میں کالج کا ناظم یا پرنسپل یہ دیکھتا ہے کہ عین ظہر کی نماز یا جمعہ کی نماز کے وقت طلبہ فٹ بال یا والی بال کھیل رہے ہیں تو وہ ایک قانونی حکم نامہ بھی جاری کرسکتا ہے کہ نماز کے وقت کھیل ممنوع ہے۔ وہ طلبہ سے خطاب کر کے انہیں عبادات کی اہمیت کا قائل بھی کرسکتا ہے اور کم از کم ہر نماز کے وقت سر پر نماز کی ٹوپی لے کر طلبہ کے درمیان سے گزر کر انہیں یہ پیغام دے سکتا ہے کہ آؤ فلاح کی طرف۔ ان تمام دعوتی طریقوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ صرف ایک کیا جائے دوسرا نہ کیا جائے بلکہ ان سب کا بیک وقت کیا جانا زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔

مدعا یہ ہے کہ جو مسلمان مغرب میں مقیم ہیں اگر وہ اپنے آپ کو مغربیت میں ڈھال کر یہ سمجھیں کہ وہ اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات اور بے بنیاد مضحکہ خیز خطرات کے بارے میں بہتر وضاحت کرسکتے ہیں تو وہ کسی خیالی دنیا میں بس رہے ہیں۔ اس کے بجائے انہیں اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھتے ہوئے دعوتی حکمت کے ساتھ اور پورے اعتماد سے بغیر کسی معذرت کے اسلام کی تعلیمات کو پیش کرنا ہوگا۔

مغرب کے اس نفسیاتی مرض کا علاج محض ایک تحقیقی مضمون، ایک اعلیٰ معیار کی کتاب، ایک علم و دانش سے بھرپور خطاب، ایک بین الاقوامی سیمینار، کانفرنس یا مکالمہ نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ڈھائی سو سال کے مسلسل گمراہ کن، علمی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی استحصالی نظام نے اسلام کی ایک تاریک تصویر مغرب کے ذہن میں بٹھائی ہے، اسی طرح ایک طویل المیعاد حکمت عملی کے ذریعہ ہی اس گمراہ کن تصور کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں اہل علم، اہل سیاست، اہل معیشت اور اہل ثقافت ہر ایک کو اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔

بین التہذیبی مکالمہ اس کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ مسلمانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوخود اپنی فکر، علمی اثاثے، تہذیب وثقافت اور بالخصوص قرآن وحدیث اور فقہ سے براہِ راست ربط ہو تاکہ علم پر مبنی طرزِ عمل مغرب کے شبہات، اشکالات اور فکری گمراہیوں کی مثبت طریقوں سے اور حکمت ودانش کے ساتھ اصلاح کی جاسکے۔ اس بین التہذیبی مکالمے کو بھی ایک عرصہ تک جاری رکھنے کے بعد ہی نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

تبدیلی فکر کا بہترین ذریعہ عملی مثال ہے۔ اگر صرف پاکستان کا معاشرہ، معیشت، سیاست اور ثقافت کا وہ نمونہ پیش کر سکے جو قرآن وسنت کا مدعا ہے تو کسی کانفرنس یا مقالہ کے بغیر مغرب اپنی آنکھوں سے اسلام کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ کر اگر چاہے تو اپنے بہت سے رویوں کی اصلاح کر سکے گا۔

......حواشی......

ا۔ حوالہ کے لیے دیکھیے Phobia پر مضمون H.J. Eysenck and W. Arnold, Wurzburg (eds), "Encyclopedia of Psychology", New York, The Seabury Press, 1972, Vol-III, p 7.

2. Will Herberg, "Protestant Catholic Jew", Anchor Books, New York, p.46-64.

© rasailojaraid.com